حافظ فضل الرحمان ندوی

قاعدے ہی سے قرآن فہمی کی بنیاد ڈال دینے

کا

ایک کامیاب منصوبہ

(۱)

سرخیل علماء حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن نور اللہ مرقدہ جب مالٹا کی اسیری سے رہائی کے بعد دیوبند تشریف لائے تو ایک روز دار العلوم میں علمائے کرام کے ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

"ہم نے تو مالٹا میں دو سبق سیکھے ہیں!"

جس برگزیدہ شخصیت نے اسّی سال تک علماء کرام کو درس دیئے ہوں خود اس نے اپنی آخری عمر میں جو سبق سیکھے ان کی تفصیل انہی کے الفاظ میں سنئے :-

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو اسباب معلوم ہوئے ایک تو ان کا قرآن کو چھوڑ دینا اور دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی ....."

اس کے بعد اس مردِ مومن نے اپنی ضعیف العمری کے باوجود اپنے جس مجاہدانہ عزم کا اظہار فرمایا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کردوں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت کیا جائے۔"

(دعوت مورخہ ۲۲ر جون ۷۷ء)

(۲)

"قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کرنے" کی صدائے بازگشت اب سے چند سال پہلے حضرت مولانا محفوظ الرحمن نامیؒ کی

"فہم قرآن کو جمہوری بنانے" کی اس مبارک تحریک کے ذریعے بھی بلند ہوئی تھی۔ جو ان کے اس تخیل پر مبنی تھی کہ :-

" ابتداء ہی سے عربی کی تعلیم شروع کر دی جائے اور قاعدہ ہی سے قرآن فہمی کی بنیاد ڈال دی جائے "

یہ تحریک ابتداء میں کافی مقبول ہوئی۔ کیونکہ فطری طور پر ہر مسلمان کے دل میں یہ تمنا کروٹیں لیتی رہتی ہے کہ وہ اور اس کے بچے کم از کم اتنی عربی تو ضرور ہی سیکھ لیتے جس سے "ترجمہ قرآن مجید" سمجھنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہو جاتی اور اس کے لئے وہ عربی کے کسی ایسے نصاب تعلیم کی تلاش و جستجو میں رہا کرتے ہیں جس کے ذریعہ ان کی یہ تمنا آسانی کے ساتھ اور کم سے کم مدت میں پوری ہو سکے۔

لیکن بعض وجوہ سے یہ تحریک کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ اور صرف مخصوص حلقوں میں محدود ہو کر رہ گئی۔

اس میں ایک اہم تر اور بنیادی وجہ یہ تھی کہ "قاعدے ہی سے قرآن فہمی کی بنیاد ڈال دینے" کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو طریقہ کار مولانا موصوف نے پیش فرمایا تھا۔ اس پر مکاتب کے موجودہ مدرسین کے ذریعہ عمل کرنا ناممکن تھا چنانچہ انہوں نے خود ہی اس طرف اشارہ بھی کر دیا تھا کہ :

• مکاتب میں جو حفاظ میاں جی اور مولوی صاحبان تعلیم قرآن پر مامور ہیں وہ غریب خود بھی ایک آیت کا ترجمہ نہیں سمجھتے۔ بچوں کو ترجمہ کیا سکھائیں گے "

اور انہوں نے اس بنا پر بھی مکاتب کی اصلاح حال کے لئے وہ تجویز پیش کی تھی جس کا تذکرہ پہلے "عربی مکاتب کا تنقیدی جائزہ" میں کیا جا چکا ہے یعنی

" یہ نہایت ضروری ہے کہ قاعدہ پڑھانے والے مدرسین بہت قابل اور طریقہ تعلیم سے واقف ہوں "

لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے یہ تجویز عمومی حیثیت سے اس وقت بھی ناقابل عمل تھی اور آج بھی ناقابل عمل ہے۔

(۳)

تاہم چونکہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر اٹل ہے۔ کہ "قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کرنے" کا اس سے زیادہ بہتر اور وسیع و مؤثر تر کوئی اور ذریعہ نہیں ہے کہ

" قاعدہ ہی سے قرآن فہمی کی بنیاد ڈالی جائے "

اور اس منصوبے کو کامیاب بنایا جائے۔ اس لئے اس منصوبے کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے طریق کار اور نصاب تعلیم دونوں ہی میں ایسی بنیادی و تعمیری تبدیلی ناگزیر تھی جو قابل عمل اور حقیقت پسندی پر مبنی ہو۔

اس سلسلہ میں "حقیقت پسندی" یہ ہے کہ "مکتب" اور "مدرسہ" کی ہر دو اکائیوں کے دائرۂ عمل اور حدودِ کار کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے "مکتب" کو بس اسی حد تک استعمال کیا جائے جو اس کے دائرۂ کار اور اس کی رالیعنی معصوم بچوں اور ناواقف مدرسین کی طاقت و

استطاعت سے باہر اور بالاتر نہ ہو۔

"مکتب" کا دائرہ عمل اور مطمح نظر صرف "قرآن خوانی" کی تعلیم تک محدود ہے اور "قرآن فہمی" کی تعلیم کا آغاز اور اس کی تخم ریزی و تکمیل "مدرسہ" کے حدود میں داخل ہے۔

"مکتب" کا دائرہ عمل اور مطمح نظر صرف "قرآن خوانی" کی تعلیم تک محدود ہے۔ اور "قرآن فہمی" کی تعلیم کا آغاز اور اس کی تخم ریزی و تکمیل "مدرسہ" کی حدود میں داخل ہے۔

اس صورت حال میں جیسا کہ تجربات سے ثابت ہوا۔ اس قدر تبدیلی کی گنجائش یقیناً موجود ہے۔ کہ مکتب میں "ابجد خوانی" سے "آغاز ناظرہ" تک کی "عبوری تعلیم" کے لئے ایسا نصاب (قاعدہ) مرتب کیا جائے جو "ابجد خوانی" سے آغاز ناظرہ" تک کی "عبوری تعلیم" کے لئے ایسا نصاب (قاعدہ) مرتب کیا جائے جو "یسرنا" کے طرز پر ہو اور جس کے ذریعہ قرآن خوانی کی استعداد اور اصل مقصد) کے ساتھ ہی ساتھ ضمناً "فہم عربی" کی استعداد نیز "مبادیات قرآن فہمی" سے مناسبت (ثانوی مقصد) بھی بمصداق "ایک پنتھ دو کاج" نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہوتی جائے اور جسے بروئے کار لانا ہمارے موجودہ مدرسین مکاتب کے لئے مشکل اور ناممکن بھی نہ ہو۔

(۴)

چنانچہ "قاعدہ تعلیم القرآن بامعنی" کے ذریعہ "عربی ابجد خوانی کی بامعنی تعلیم" کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ اسی مذکورہ بالا نظریہ پر مبنی ہے۔ اور طریقہ کار یہ ہے کہ اس کے ذریعہ ابجد خوانی کی بامعنی تعلیم کا سلسلہ "آغاز ناظرہ" تک تو اختیاری طور پر لیکن زیر بحث منصوبے کی پیش رفت کے لئے تعلیم ناظرہ کی مدت تک لازمی طور پر رکھا جائے اور بعد ازاں منصوبے کی تکمیل کی ذمہ داری "مدرسہ" کے سپرد کر دی جائے۔

جس طرح یہ مناسب نہیں ہے کہ قرآن فہمی کے سلسلہ میں جو کچھ مدرسہ میں حاصل ہو سکتا ہے اسے مکتب ہی میں حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح یہ بھی مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ جتنا کچھ مکتب میں ضمناً نہایت آسانی اور بڑی خوب صورتی کے ساتھ بلکہ یوں سمجھئے کہ از خود حاصل ہو سکتا ہے اسے بھی حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

اگر "کل" ہاتھ نہ آسکے تو "جزو" کو بھی چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے کیونکہ "کل" کی ابتدا "جزو" ہی سے ہوتی ہے جو "کل" کا پیش خیمہ بنتا ہے۔

(۵)

جہاں تک "قاعدہ ہی سے قرآن فہمی کی بنیاد ڈال دینے" کے زیر بحث منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کارکنوں کی فراہمی کا سوال ہے تو ہمارے موجودہ "حفاظ، میاں جی اور مولوی صاحبان ہی جنہوں نے

باقی صـ ۱۴ پر